گوشہ الطاف حسین حالی

(۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء)

۱۔ شبلی وحالی: تعلقات کا ازسرِ نو جائزہ — خالد ندیم

۲۔ حالی کی ملّی شاعری میں نعتیہ عناصر — طاہر قریشی

۳۔ الطاف حسین حالی کی نظم ونثر میں مشرق ومغرب کی کشمکش — تہمینہ نور

۴۔ مولانا الطاف حسین حالی کی عربی مکتوب نگاری پر ایک نظر — عبدالغفار/ حافظ محمد شہباز حسن

۵۔ *The Musaddas of Hali - a reinterpretation* — سیّد منیر واسطی

شبلی وحالی.....تعلقات کا ازسرِنَو جائزہ

ڈاکٹر خالد ندیم ☆

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی کے باہمی تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہے، جن کا اظہار دونوں کے سوانحی حالات اور پھران کی مراسلت سے لگایا جاسکتا ہے۔ حالی عمر میں شبلی سے بیس برس بڑے تھے، لیکن تعلقات کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے شبلی کا بزرگ بننے کی کوشش نہیں کی، شاید وہ برادرِ بزرگ بننے کو بھی تیار نہ تھے، یہی وجہ ہے یہ کہ انھوں نے زندگی بھر شبلی کا احترام ملحوظ رکھا۔

شبلی وحالی کے مابین بعض امور میں اگر کبھی اختلاف ہوا بھی تو دھیمے سُروں میں؛ لیکن مہدی افادی، مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی نے دونوں بزرگوں کے درمیان اختلافات کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔

مہدی افادی نے اپنے ایک مضمون 'حالی وشبلی کی معاصرانہ چشمک' کے ذریعے ان 'اختلافات' کو خوب ہَوا دی، لکھتے ہیں کہ 'اصلی کام حالی وشبلی کو باہم ٹکرانا ہے'۔ [۲] مضمون میں اس 'چشمک' کی کئی ایک مثالیں دینے کے بعد مہدی کہتے ہیں کہ 'یہاں تک تو چشمک کی صرف نرم مثالیں تھیں، یعنی تلخ گولیاں غلافِ شکر میں، اَب ذرا قوی شواہد لیجیے'۔[۳] البتہ مضمون کے آخر میں آکر یہ بیان داغ دیتے ہیں کہ 'میری غایت محض تشحیذِ ادب، یعنی احباب کی دِماغی تفریح کے سوا اَور کچھ نہیں ہے'۔[۴] لیکن یارلوگ تو 'معاصرانہ چشمک' کو لے اُڑے، حتیٰ کہ اس جملے کی بازگشت آج تک سنائی دے رہی ہے۔ اس حوالے سے آلِ احمد سرور کا تبصرہ بہت اہم ہے، لکھتے ہیں:

> ''ہم لوگوں میں یہ ایک عام کمزوری ہے کہ پہلے انسانوں کے بُت بناتے ہیں اور پھران بُتوں کو آپس میں ٹکرا کر خوش ہوتے ہیں۔ خدا جانے، کس گھڑی میں مہدی افادی نے حالی اور شبلی کی 'معاصرانہ چشمک' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا کہ اب ادبی حلقوں میں حالی وشبلی کا موازنہ اور ایک کو دوسرے سے بڑھانے یا گھٹانے کی کوشش اچھا خاصا فرض بن گئی ہے۔'' [۵]

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ سرگودھا۔

عبداللطیف اعظمی کا کہنا ہے کہ 'موصوف نے صرف معاصرانہ چشمک کی تصنیف ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے بہت سے خطوط میں بھی اس کی شکایت کی ہے'۔[۶] یوں یہ روایت آگے بڑھتی رہی، چنانچہ ان 'اختلافات' کو نمایاں کرنے میں مولوی عبدالحق کی 'خدمات' بھی قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی صاحب کے خیال میں، حالی کے برعکس 'شبلی کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا'، چنانچہ 'جب کبھی ان کے دل میں کوئی بات آتی تو فوراً کہہ گزرتے'۔ مولوی صاحب کے مطابق، 'وہ نجی صحبتوں میں ایسی باتیں کرتے تھے، جن سے سرسید اور مولانا حالی کی تنقیص نکلتی تھی'، اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے:

> جن دِنوں حیاتِ جاوید شائع ہوئی تو مولانا شبلی کے لیے، جو اُس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارِد تھے، مَیں نے یہ کتاب لے جا کر ان کی خدمت میں پیش کی۔ اُس وقت وہاں اَور بھی کئی اشخاص موجود تھے۔ مولانا شبلی نے یہ کتاب دیکھتے ہی فرمایا، 'یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے'۔ مولانا نے کتاب کو پڑھے بغیر ہی یہ رائے دے دی۔[۷]

اب اگر اس بیان کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے یہ فرض کر کے کہ حیاتِ جاوید کا اوّلین نسخہ اُن کے پاس آیا، انھی نے اسے شبلی کے سامنے پیش کیا اور شبلی نے بغیر تردّد کے اس پر تبصرہ کر دیا، حالانکہ بقول شیخ محمد اکرام، 'وہ [شبلی] کتاب کی عام اشاعت سے پہلے اسے یا اس کے بعض اجزا دیکھ چکے تھے'۔[۸] ویسے بھی حیاتِ جاوید سے متعلق شبلی کی تنقیدی رائے کوئی راز کی بات نہیں، بلکہ اس کا اظہار تو انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام اپنے دو خطوط میں بھی کیا ہے (جن کا آئندہ سطور میں آئے گا)۔

مولوی صاحب مولانا حالی کو 'بڑے صاحبِ دل آدمی' قرار دیتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ حالی نے 'ان [شبلی] کی کتابوں پر بڑے اچھے تبصرے کیے اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں، ان کی جی بھر کر داد دی'۔ مولوی صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۰۶ء کو حالی نے شبلی کو ایک طویل خط لکھا، جس سے دونوں کے تعلقات کی گہرائی، خلوص اور باہمی عقیدت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شبلی کی تصانیف کے بارے میں حالی کے خیالات کا اظہار بھی۔ حالی لکھتے ہیں:

> ''اِس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے وُرود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کام کیا، جو پیراہنِ یوسف نے چشمِ یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔
>
> میری کوتاہ قلمی سے اگر آپ یہ سمجھے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ مَیں آپ کے حقوقِ صحبت کو بھول گیا ہوں، مگر مولانا! یہ تغافل اسی قسم کا ہے، جس کی نسبت کہا گیا ہے..... تغافلے کہ کم از صد نگاہ حسرت نیست۔ مَیں اپنے حالات کی تفصیل لکھ کر آپ کو ملول کرنا نہیں چاہتا۔
>
> آپ کے گراں بہا عطیہ کا وِل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، گو اس سے پورا پورا مستفید نہیں ہو سکتا۔ ایک آنکھ سے بالکل نظر نہیں آتا، دوسری آنکھ میں بھی موتیا کا پانی آنا شروع ہو گیا ہے۔ داہنی آنکھ بنوانے کا ارادہ ہے، لیکن کھانسی کی وجہ سے فروری تک آپریشن کرانا ملتوی کر دیا ہے۔..... چونکہ مَیں بذاتِ خود کتابوں سے کما حقہ استفادہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے اپنی ہوس کو اس طرح پورا کرتا ہوں کہ اَور لوگوں کے لیے لائبریری سے کتابیں منگواتا ہوں..... اسی بنا

پر سوانح مولانا روم لائبریری کی طرف سے منگوائی گئی تھی، لیکن چونکہ وہ آپ نے خاص میرے لیے عنایت فرمائی ہے، اس لیے اس کو اپنے پاس رکھوں گا اور لائبریری کے لیے دوسرا نسخہ اسی درجے کا بصیغہ ویلو پی ایبل ارسال فرمانا ہوگا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ کی جملہ تصانیف لائبریری میں آ گئی ہیں۔ صرف الغزالی اَب تک نہیں آئی تھی، لیکن اَب عبداللہ خاں کو حیدرآباد لکھ دیا گیا ہے کہ اس کا ایک نسخہ فوراً بھیج دیں۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ المامون اور سیرۃ النعمان بھی آ گئی ہیں یا نہیں، مَیں لائبریرین سے دریافت کر کے ان کے لیے بھی شاید تکلیف دوں۔ باقی الفاروق، سفرنامہ روم و مصر وغیرہ، رسائلِ شبلی، تاریخِ علمِ کلام کے دونوں حصے [الکلام اور علم الکلام]، یہ سب کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ سوانح کے ساتھ دیوانِ فارسی بھی پارسل میں شامل کرا دیجیے گا۔

سوانح [مولانا روم] کو مَیں اَب تک ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں۔ اوّل مولوی وحیدالدین دیکھنے کو لے گئے، ان کے بعد غلام حسین نے مانگ لی۔ آپ کی تصنیفات کی نسبت مَیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ من حرف منزلتکم فی الصنیف کل لسانہ۔ آپ کا وجود قوم کے لیے باعث فخر ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ و سلامت رکھے۔

موازنہ انیس و دبیر کا مسودہ مَیں نے میر کاظم علی صاحب معتمد تعمیراتِ سرکارِ عالی سے بڑے تقاضوں کے ساتھ حیدرآباد میں منگوا کر دیکھا تھا اور جس رقعہ کے ساتھ ان کے دفتر میں اس کو واپس بھیجا تھا، اس میں ان کو بہت غیرت دِلائی تھی کہ اَب تک اس کے شائع کرنے کا یہاں کسی کو خیال نہیں آیا، یا تو سرکار کی طرف سے آپ اس کو چھپوا دیں یا بعض اشخاص، جو اس کے چھاپنے پر آمادہ ہیں، ان کو اجازت دے دیں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اس مسودے کو خود مولانا کے پاس بھجوا دیں، کیونکہ اس میں جا بجا کورے اَوراق چھوڑ دیے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس میں کچھ اَور اضافہ کرنا منظور ہے۔ میر کاظم علی صاحب نے بہت دِن کے بعد اس کا یہ جواب دیا کہ سرکار سے اس کے چھاپنے کی منظوری لے لی گئی ہے، لیکن باوجود اس کے کہ مَیں اس کے بعد کئی مہینے تک وہاں ٹھہرا رہا، میرے سامنے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بفرضِ محال چھپتا بھی تو بالکل مسخ ہوتا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں چھپنے کو دے دیا۔ جب موازنہ بالکل چھپ جائے تو ازراہِ عنایت اس کی بھی ایک جلد سیکرٹری وکٹوریا میموریل لائبریری کے نام ضرور بصیغہ ویلو پی ایبل بھجوا دیجیے گا۔"[۹]

یہی نہیں کہ مولانا حالی شبلی کی قدر کرتے تھے، بلکہ جہاں انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ شبلی کو نظرانداز کیا گیا ہے، وہ اس پر حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے ایک فہرست تیار کی، جس میں کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کیا گیا تھا، جن کے کام پر تنقیدی مضامین لکھنے کا منصوبہ تھا۔ دانستہ یا نادانستہ اس میں شبلی کا نام شامل نہ ہو سکا تو مولانا حالی نے انھیں لکھا:

"جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کام پر کریٹکل ایسے [critical essay] لکھے جائیں، ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد صاحب

میرے نہایت دوست ہیں اور اردو ڈکشنری لکھنے میں جو محنت اور استقلال انھوں نے دِکھایا ہے، اس کی مَیں دل سے قدر کرتا ہوں۔ ان کی ڈکشنری پر ۸۸ء میں ایک لمبا ریویو مَیں خود لکھ چکا ہوں، مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو مَیں اُن کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو، مَیں اَور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔[۱۰]

خود مولوی عبدالحق نے بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ شبلی پر بے جا تنقید پر بھی حالی خاموش نہیں رہتے تھے۔ اگرچہ ان کا لہجہ دھیما ہوتا تھا، لیکن وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں نے دکن ریویو میں مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر دو مضامین لکھے، جن میں بقول مولوی عبدالحق، 'کسی قدر شوخی سے کام لیا گیا تھا'۔ جب حالی حیدرآباد جانا ہوا تو ان کی ظفر علی خاں سے ملاقات ہوگئی۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

''دورانِ گفتگو میں انھوں نے متذکرے مضامین کے متعلق ظفر علی خاں کو ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنا شروع کی کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور وہ سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا، 'مَیں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔''[۱۱]

مندرجہ بالا اقتباسات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حالی کے دل میں شبلی کی بڑی قدر تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شبلی بھی 'بڑے صاحبِ دل آدمی' تھے۔ نواب محسن الملک کے نام ۱۹/اپریل ۱۹۰۳ء کے خط میں شبلی نے حالی کو 'ہمارے بزرگ مولانا حالی' کہہ کر یاد کیا ہے۔[۱۲] حالی نے شبلی کو حیاتِ سعدی کا نسخہ بھیجا تو شبلی نے اُس پر نہ صرف تبصرہ کیا، بلکہ مولوی محمد سمیع کو اس کے مطالعے کی ترغیب دِلاتے ہوئے لکھا:

''یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ مَیں نے بے اختیار اس کو تمھارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمھارے نام بھیج دیں۔ دیکھو، کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کتاب کے اَور خریدار پیدا کرنے چاہییں۔''[۱۳]

گویا مولوی صاحب جن معنوں میں مولانا حالی کو 'بڑے صاحب دل آدمی' قرار دیتے ہیں، شبلی بھی انھی اوصاف سے متصف تھے۔ اس بات کے ثبوت میں ایک اَور مثال پیش کی جا سکتی ہے، یعنی جب شعرالعجم کی دوسری جلد میں شیخ سعدی کے حالات قلم بند کرنے کا وقت آیا تو شبلی نے حاشیے میں حالی کو درج ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

''مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔''[۱۴]

شبلی یادگارِ غالبؔ کے متعلق بھی نہایت اچھی رائے رکھتے تھے۔ شیخ رشیدالدین انصاری کے کسی سوال کے جواب میں شبلی نے لکھا کہ 'مرزا غالب کے حالات و ریویو حالی صاحب نے جس تفصیل سے لکھے ہیں، اس کے بعد کسی اَور کتاب کی کیا

ضرورت ہے۔'' ۱۵

شبلی و حالی کے مابین اختلافات پر گفتگو کرنے کے بعد مہدی افادی کی طرح مولوی عبدالحق بھی وضاحت کرتے ہیں کہ 'مولانا شبلی کو مولانا حالی سے کوئی بغض نہ تھا'۔ ۱۶ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ دونوں بزرگوں کے دلوں میں کوئی بغض نہیں تھا تو پھر ان کے مابین مبینہ 'اختلافات' کو نمایاں کرنے کا کیا سبب تھا۔

حیاتِ شبلی میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ مولانا شبلی کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور اُلفت تھی، ساتھ ہی دو اقتباسات دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 'یہ چوٹ مولانا حالی پر ہے'، حالانکہ دونوں اقتباسات میں حالی کا براہِ راست ذکر نہ تھا؛ البتہ حیاتِ جاوید سے متعلق ایک دو جملوں سے شبلی کی ناپسندیدگی ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ حبیب الرحمٰن شروانی کے نام شبلی نے حیاتِ جاوید کو سید صاحب کی یک رُخی تصویر اور مدلل مداحی قرار دیا۔ ۱۷ اس سے پہلے وہ یہ بھی لکھ چکے تھے کہ حیاتِ جاوید کو میں لائف نہیں، کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔ ۱۸

چونکہ حالی کی نسبت سرسید سے شبلی کی قربت بہت زیادہ تھی، چنانچہ بقول شیخ محمد اکرام، 'اگر ان [شبلی] کی طبیعت کو کسی معاصر کے حالات لکھنے گوارا ہوتے تو وہ حالی کی نسبت کہیں زیادہ مکمل اور زیادہ دلچسپ تصویریں پیش کرتے'۔ ان کے نزدیک، 'حالی کا کام ایک ریسرچ سکالر کا تھا، انھوں نے سرسید کے کریکٹر اور کارناموں کے بنیادی پہلوؤں اور بنیادی احسانات کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا، لیکن پھر بھی کئی اہم معاملات کے اہم پہلو رہ گئے ہیں'، ۱۹ اور آلِ احمد سرور نے حالی کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا تھا کہ 'وہ وہاں بھی خاموش رہتے ہیں، جہاں خاموشی گناہ ہے'، چنانچہ 'انھوں نے سرسید کی بہت سے کوتاہیوں کی تاویلیں کی ہیں'۔ ۲۰

حالی سے متعلق شبلی کے مذکورہ بالا خیالات پر خود ان کے قریبی دوست مہدی افادی نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ اگرچہ ان کا یہ کہنا ادبی تنقید کا حصہ نہیں بن سکتا کہ 'شیش محل میں بیٹھ کر اَوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی، لیکن کیا دانائی بھی ہے'، ۲۱ البتہ ان کا یہ سوال قابلِ توجہ ہے کہ 'بلحاظِ فن حالی کے جس اقتصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے، خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک اُبھار کر دِکھائی گئی ہے؟' ۲۲

بہرحال، کسی ہم عصر کی ایک کتاب پر تنقیدی رائے سے 'معاصرانہ چشمک' کا مذکور غالباً عجلت پسندی ہے، ورنہ تو شبلی مولانا حالی کے علم و عرفان کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ انھیں خود پر برتری دیتے تھے۔ خود کو دریا اور حالی کو کنویں سے تشبیہ دیتے ہوئے انھوں نے اس امر کا اعتراف کیا:

''جب تک کافی مواد تحریر موجود نہ ہو، مَیں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ اُن کی دقیقہ رَس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔'' ۲۳

اس کے ثبوت میں سید سلیمان ندوی کا درج ذیل بیان نہایت اہم ہے:

''مولانا کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور الفت تھی اور اُن کی

وقتِ نظر اور ان کی سخن فہمی کے ہمیشہ مداح رہے۔ فرماتے تھے کہ وہ جوہر کو خوب سمجھتے تھے اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی۔ رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے۔ صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ 'یہ نثر کا حماسہ ہے'۔ مولانا [شبلی] کہتے تھے کہ اُن کے اس ایک فقرے نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا اور اُس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آیا، جو پہلے سامنے نہ تھا۔'' ۲۴

جنوری ۱۸۹۴ء میں جب شبلی کو 'شمس العلما' کا خطاب ملا تو علی گڑھ کالج کی علمی مجلسوں نے ۱۹ر جنوری کو ان کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ ترتیب دیا، جس میں جملہ اکابرِ کالج نے شرکت کی، بالخصوص سرسید احمد خاں، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب مزمل اللہ خاں، مسٹر بیک (پرنسپل کالج)، پروفیسر آرنلڈ، جسٹس سید کرامت حسین (پروفیسر)، خواجہ غلام الثقلین، مولانا ظفر علی خاں، مولوی بہادر علی، بعض طلبہ اور مولانا الطاف حسین حالی شامل تھے۔ دیگر اکابر کی طرف سے تہنیتی تقاریر کے علاوہ اس جلسے کی خاص بات مولانا حالی کا تیرہ اشعار پر مشتمل قصیدہ 'من الحبیب الی الحبیب' تھا، جو انھوں نے اس موقعے کے لیے لکھا تھا۔ قصیدے کے اوّلین تین اشعار پیش کیے جاتے ہیں: (مترجمہ سید سلیمان ندوی)

یا وحیداً من الکرام فریداً
و عزیزاً کمثل علقِ نفیس

[اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ اور نادر الوجود، مثل نفیس و نادر چیز کے]

انت اولی بان تُلَقَّبَ شمساً
بَل بانْ یَّجْعَلون شمس الشموس

[تُو اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے، بلکہ اس بات کا کہ تجھ کو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے]

انت شمسُ الھُدیٰ و لستَ بشمس
یعتریھا الخنوس بعد الخنوس

[تُو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں، جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے] ۲۵

اس قصیدے کا جواب شبلی نے یورپی خواتین و افسران اور رؤسا و طلبہ علی گڑھ کالج کی طرف سے اسٹریچی ہال میں ۱۷ر فروری ۱۸۹۴ء کو منعقدہ ایک عظیم الشان جلسے میں دیا، جس میں رسم خلعت اور عطاے خطاب سرکاری طور پر ادا کی گئی۔ اس موقع پر اپنے خطاب کے آخر میں شبلی نے کہا:

''عطاے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگانِ قوم نے مبارک بادی کے جو خطوط لکھے اور میرے رُتبہ اور حالت سے بہ درجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدر دانی کا اظہار کیا، ان کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مَیں 'ایاز قدر خود شناس' کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف و عزت کی باعث ہیں اور مَیں ان بزرگوں کا جس

قدر شکریہ کروں، کم ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے، وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے، اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت ان بزرگانِ قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار، جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں؛ علی الخصوص لسان الملک، فخرِ قوم اور مخدومِ قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہ کی نظم، جو جنابِ موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لیے تمغائے فخر اور سندِ عزت ہے۔ بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے، جو مجھ کو حاصل ہو سکتی تھی اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔'' ۲۶

ایک طرف حالی کا خراجِ عقیدت تو دوسری جانب شبلی کی طرف سے حالی کی نظم کو تمغائے فخر اور سندِ عزت قرار دینے سے دونوں کے گہرے اور پُر خلوص تعلقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب مولانا حالی کو 'شمس العلما' کا خطاب دیا گیا تو مولانا شبلی نے کہا کہ 'اَب اس خطاب کی عزت بڑھ گئی ہے'۔ ۲۷

۱۸۹۹ء میں شبلی کی علالت اس حد تک شدت اختیار کر گئی کہ انھیں زندگی کی امید نہ رہی۔ ایسے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو گونڈہ کے ایک اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کی اعظم گڑھ تعیناتی سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ 'انھوں نے عجیب گرم جوشی سے علاج کیا اور اس سے کچھ فائدہ بھی ہے'۔ ۲۸ پھر کچھ امید بندھی تو ۱۱ر جون ۱۸۹۹ء کو انھی کو لکھا کہ 'اگر خدا نے صحت کامل دی تو مَیں اپنے تمام خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے'۔ ۲۹ اسی سلسلے میں شبلی نے گیارہ اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی، جس کے آخری دو شعر ملاحظہ کیجیے:

مژدۂ صحتِ من ہاں برسانند کنوں
ہر کسے را کہ بمن دعویٰ اخلاص و وفاست
می تواں گفت بہ مہدی و بہ حالی و عزیز
بہ شد آں بندہ کہ از حلقہ بگوشانِ شماست ۳۰

مرض سے نجات کے بعد مذکورہ بالا 'قصیدہ کشمیریہ' تخلیق ہوا تو اس کی کاپیاں دوستوں کو بھی ارسال کیں۔ مولانا حالی کو بھی بھیجیں، جن کے جواب میں انھوں نے درج ذیل خط لکھا:

''قصیدۂ کشمیریہ کی متعدد کاپیاں وصول ہوئیں۔ پہلے اس سے کہ آپ کے عطیے کا شکریہ ادا کروں، مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، جس نے مدتِ دراز کے بعد آپ کی صحت کا مژدہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا۔ فی الواقع آپ کی حالت نازک ہو گئی تھی اور مرض کو حد سے زیادہ امتداد ہو گیا تھا، باوجود یکہ آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی، مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا۔ اَب درحقیقت صرف خدا کے فضل پر اور بحسب ظاہر شفیق و ہمدرد معالج پر صحت کا انحصار ہے۔ اذا اراد اللّٰہ شیئاً ھیأ اسبابہ، ایسی حالت میں ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب کا اعظم گڑھ میں آنا صاف دلالت کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو ابھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا۔ فالحمد اللّٰہ ثم الحمد للّٰہ علی ما انعم علینا با بقائکم و بنعمۃ وجوکم لدینا۔'' ۳۱

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی، شبلی کی صحت وسلامتی کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں اور ان کی صحت یابی کی اطلاع پاکر اللہ کے حضور شکر ادا کرتے ہیں۔ حالی کے مذکورہ بالا خط میں سات اشعار پر مشتمل 'قطعہ در شکر صحت یابی شمس العلما مولانا شبلی نعمانی' درج کیا، جس کا پہلا شعر پیش کیا جاتا ہے:

للّٰہ الحمد پس از ناخوشی و رنجِ دراز
شبلی ما بہ مراد از سرِ بالیں برخاست ۳۲

یہی نہیں، بلکہ انھیں شبلی کی فتوحات سے بھی خاص دلچسپی ہے، چنانچہ روم میں منعقدہ اورینٹل کانفرنس میں شبلی کی متوقع شرکت کے بارے میں استفسار کے ذریعے اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہیں:

''مسٹر آرنلڈ کی تحریر سے اور نیز آپ کے اعلان سے، جو چودھویں [؟] میں چھپا تھا، یہ معلوم ہوا تھا کہ اورینٹل کانفرنس میں، جو اِس سال روم یا اٹلی میں ہونے والی ہے، آپ کا بھی ارادہ تشریف لے جانے کا ہے اور مَیں خیال کر رہا تھا کہ آپ روانہ ہو گئے ہوں گے، مگر قصیدۂ مذکور کے وصول ہونے سے معلوم ہوا کہ ابھی آپ اعظم گڑھ میں تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے تاریخ روانگی ٹھیک طور پر یاد نہیں رہی۔ معلوم نہیں کہ ارادہ فسخ ہو گیا یا تاریخ معین ابھی نہیں آئی۔'' ۳۳

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کالج کے حالات سے دونوں کو دلچسپی تھی، چنانچہ جب کالج کے حالات زیادہ ہی ابتر ہو گئے تو شبلی کی طرح حالی بھی پریشان رہنے لگے:

''مسٹر بک کے مرنے کا قبل از وقت ایسا افسوس ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ سید محمود کی بے اعتدالیاں اَب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور لوگوں کو اُن کی آڑ میں کالج کو درہم برہم کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے۔ مَیں نے سنا ہے کہ محسن الملک کو نواب لفٹنٹ گورنر نے نینی تال پر بلایا ہے۔ سید محمود پر یزیڈنٹی سے علیحدہ کرنا نہایت ضرور ہے۔ کاش! ہرز آنر اُن کے برطرف کرنے کا مشورہ دیں۔ مسٹر ماریسن کو مسٹر بک کی جگہ پر نسپلی پر ولایت سے بلایا گیا ہے، مگر معلوم نہیں کہ انھوں نے تار کا کیا جواب دیا؟ دو نئے پروفیسر ولایت سے اَور بلائے ہیں۔ سر دست کالج کی حالت نہایت نازُک ہے۔ خدا انجام خیر کرے۔'' ۳۴

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا یہ کہنا بجا ہے کہ 'شبلی کے علی گڑھ سے ترکِ تعلق کے بعد وہاں کے نازُک حالات کا مولانا حالی نے ان سے جس انداز میں ذِکر کیا ہے، وہ دونوں کے ذہنی اشتراک کا بھی پتا دیتا ہے'۔ ۳۵

۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کے روز اتفاقیہ بندوق چل جانے سے شبلی کے گزندِ پا کا واقعہ پیش آیا۔ اخبارات کے ذریعے یہ اطلاع ان کے تلامذہ، معتقدین اور احباب تک پہنچی تو ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی، ایسے میں بہت سے عیادت کو آئے، بعض نے خطوط لکھ کر خیریت معلوم کی۔ حالی بھی شبلی کے ایک پاؤں کے ضائع ہو جانے پر افسردہ تھے اور ان کی عیادت کے لیے بھی بے قرار، لیکن ایک تو اُن دِنوں حالی نے آنکھ بنوائی ہوئی تھی اور ڈاکٹروں نے انھیں لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا تھا، دوسرے کبرِسنی، چنانچہ وہ فوری طور پر اعظم گڑھ تک کا سفر نہ کر سکے۔ ایسے میں ان کے صاحب زادے حامد حسن نعمانی کے نام ایک خط میں اپنے خیالات و جذبات کا

اظہار کرتے ہیں:

''آج تک جو کچھ اخبارات کے حوالے سے جناب مولانا [شبلی] کے حالات سنے گئے ہیں، ان سے کچھ تشفی نہیں ہوئی، اس لیے ناچار آپ [حامد حسن نعمانی] کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ میرا یہ خط مولانا کو دکھا کر اور جو کچھ وہ اپنا حال لکھوائیں، اس کو قلم بند کر کے ازراہِ لطف میرے پاس بھیج دیں، نیز یہ بھی [کذا] لکھیں کہ بمبئی ڈاکٹر رجب علی، جو مولانا کو وہاں سے بلاتے ہیں، وہاں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔..... مولانا کے دیکھنے کو اعظم گڑھ آنے کا بھی قصد ہے، مگر اب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا۔ اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڑھ آنے سے پہلے آپ کو اطلاع دوں گا۔ مولانا کی خدمت میں بصد حسرت دیدار و اشتیاق زیارت سلام و نیاز کہہ دیجیے گا۔''۳۶

شبلی کی زندگی کا یہ حادثہ ایک طرف ایک المیے کا باعث بنا تو دوسری جانب اس واقعے کی کئی ایک شاعرانہ توجیہات بھی سامنے آئی۔ شبلی کے تلامذہ اور بعض احباب نے اس سانحے پر رباعیات و قطعات لکھے، جو سید سلیمان ندوی کے سپرد کر دیے گئے، جنھوں نے یہ تمام شعری کاوشیں الندوہ کے دو شماروں (ستمبر اور اکتوبر) میں شائع کر دی۔ ان رباعیات کو دیکھ کر مولانا حالی نے بھی ایک رباعی کہی اور مینیجر الندوہ کو بھیج دی۔ حالی نے لکھا:

رسالہ الندوہ میں مولانا شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر مجھے بھی یہ خیال ہوا کہ ان کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کروں، لہٰذا ذیل کے چار مصرعے موزوں کر کے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں ان کو بھی درج فرما دیجیے گا:

شبلی کہ گزندِ پاش بر دل شکن است
باخستگیش خجستگی مقترن است
چنداں کہ بکاہند فزایند اینجا
کاراستن چمن ز پیراستن است۳۷

حالی کے ان جذبات پر شبلی نے الندوہ کے شمارہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں 'مولانا حالی کی ذرہ نوازی' کے عنوان سے ایک مختصر سا شذرہ لکھا، جس میں حالی کے مذکورہ خط اور رباعی کے اندراج کے بعد ان الفاظ میں اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا:

''مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرّہ نوازی ہے۔ وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیاز مندوں کے زمرے میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں، جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے، آمین۔''۳۸

۱۹۰۸ء میں شبلی کی فارسی نظموں کا مجموعہ دستۂ گُل شائع ہوا تو حالی کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ یہ وہ مجموعہ ہے، جس میں عطیہ سے متعلق 'زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے تھے۔۳۹ جب یہ مجموعہ حالی کے مطالعے میں آیا تو وہ پکار اُٹھے:

''کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے، جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شرابِ دوآتشہ ہے، جس کے نشے میں خمارِ چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دِل رُبائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔'' ۴۰

حالی نے اس مجموعہ کلام پر شبلی کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ 'میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلامِ نظم ونثر، جو کچھ ہے، اس کو بھی چھپوا کر شائع کردوں، مگر دستۂ گُل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گریں..... و لیس فی ذلک شائبة من التصنع'۔ ۴۱

۱۹۰۹ء میں شبلی کا دوسرا مجموعہ کلام بوئے گُل شائع ہوا، جس کے بارے میں خود شبلی کو خود احساس تھا کہ بالکل پھیکا ہے ۴۲، شبلی کے مطابق:

''بُوئے گُل کی نسبت تمام اہلِ نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گُل اور اس میں جذب وسلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کے شانِ نزول اسی قدر مختلف ہیں، جس قدر دونوں کے جوش وسرمستی میں فرق ہے۔ لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں۔ وہ بُوئے گُل کو حال بتاتے ہیں اور دستۂ گُل کو قال۔'' ۴۳

مذکورہ بالا تمام بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حیاتِ جاوید پر چند جملوں کے علاوہ شبلی کے زبان وقلم سے حالی سے متعلق شاید ہی کوئی ناگوار جملہ ادا ہوا ہو۔ رہی بات حیاتِ جاوید پر اعتراض کی تو بقول سید سلیمان ندوی، 'یہ مولانا حالی کی ذات پر نہیں، جن کی وہ بے حد قدر کرتے تھے، بلکہ سرسید کے ناتمام باگیرفی (سوانح عمری) پر اظہارِ خیال ہے'۔ سید صاحب کے خیال میں، 'اگر حیاتِ جاوید کا مصنف مولانا کا کوئی عزیز بھی ہوتا، تب بھی وہ اس تصنیف کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کرتے'۔ ۴۴ وجہ محض یہ تھی کہ شبلی سرسید کے دورِ آخر کی پالیسیوں سے متفق نہ تھے۔ سرسید سے اختلاف تو حالی کو بھی تھا، اس امر کی تصدیق آلِ احمد سرور بھی کرتے ہیں:

''حالی بھی ایک زمانے میں حیاتِ جاوید لکھنے کا ارادہ ترک کر چکے تھے اور سرسید کے مرنے سے کچھ پہلے، پیسہ اخبار میں ان کا، وقار الملک اور محسن الملک کا ایک بیان سرسید کے خلاف نکلنے والا تھا کہ ان کی وفات کی خبر نے قدرتی طور پر اسے روک دیا۔'' ۴۵

سرسید سے حالی کے درج بالا اختلاف کے بعد شبلی وحالی کی 'معاصرانہ چشمک' میں کچھ حقیقت نہیں رہتی، بلکہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دونوں بزرگوں کے درمیان احترام کا رشتہ زندگی بھر قائم رہا اور وہ ایک دوسرے کے علمی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔

❁ ❁ ❁

حوالے اور حواشی:

۱ مہدی افادی: افادات مہدی مرتبہ مہدی بیگم، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۳۹ء طبع سوم، ص ۳۱۶-۳۴۲

۲ ایضاً، ص ۳۲۳

۳ ایضاً، ص ۳۲۸

۴ ایضاً، ص ۳۴۲

۵ آلِ احمد سرور: مقدمہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں مصنفہ عبداللطیف اعظمی، دہلی: شبلی اکادمی، ۱۹۴۵ء، ص ۲-۳

۶ عبداللطیف اعظمی: مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ۵۵

۷ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، مرقومہ ۹ر جولائی ۱۹۶۰ء، مطبوعہ ادیب علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۳

۸ شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۴ء، ص ۲۳۶

۹ مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۸ر ستمبر ۱۸۹۹ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴-۴۶

۱۰ مولانا حالی بنام مولوی عبدالحق، مشمولہ مکتوباتِ حالی اوّل، مرتبہ خواجہ سجاد حسین، پانی پت: حالی پریس، ۱۹۲۵ء، ص ۳۴

۱۱ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، محولہ بالا ۷

۱۲ شبلی نعمانی بنام نواب محسن الملک، مرقومہ ۱۹ر اپریل ۱۹۰۳ء، مشمولہ مکتوباتِ شبلی مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۲ء ص ۳۴

۱۳ شبلی نعمانی بنام مولوی محمد سمیع، مرقومہ ۱۰ر مارچ ۱۸۸۶ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۱۶ء، ص ۷۹

۱۴ شبلی نعمانی: شعر العجم دوم، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبعِ جدید ۲۰۱۰ء ص ۲۵

۱۵ شبلی نعمانی بنام شیخ رشید الدین انصاری، ۲۹ر اگست ۱۹۰۷ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلیا وّل، ص ۳۱۸

۱۶ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی، محولہ بالا ۷

۱۷ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۹ر جنوری ۱۹۰۲ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی اوّل، ص ۱۴۱، ۱۴۲

۱۸ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۷ر اگست ۱۹۰۰ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلیا وّل، ص ۱۳۲

۱۹ شیخ محمد اکرام: یادگارِ شبلی، ص ۲۳۶-۲۳۷

۲۰ آلِ احمد سرور: تنقیدی اشارے، لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۵۵ء

۲۱ مہدی افادی: افاداتِ مہدی، ص ۳۳۰

۲۲ مہدی افادی: افاداتِ مہدی، ص ۳۳۳

۲۳ شبلی نعمانی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء، ص ۸۰۲

۲۴ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص ۸۰۱

۲۵ مولانا حالی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص۲۵۳-۲۵۴۔ مکمل قصیدے کے لیے رجوع کیجیے.....مولانا حالی: کلیاتِ نظمِ حالی دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء، ص۴۴۰-۴۴۱

۲۶ شبلی نعمانی بحوالہ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص۲۶۲

۲۷ مولوی عبدالحق بنام عبداللطیف اعظمی مجولہ بالا ۷

۲۸ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۸۹۹ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلیا وّل، ص۱۲۰

۲۹ شبلی نعمانی بنام حبیب الرحمٰن شروانی، مرقومہ ۱۸ر جون ۱۸۹۹ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلیا وّل، ص۱۲۱

۳۰ شبلی نعمانی: کلیاتِ شبلی فارسی مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبعِ جدید ۲۰۰۵ء، ص۲۶

۳۱ مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۸ر ستمبر ۱۸۹۹ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط، ۲۰۱۳ء، ص۴۲

۳۲ مکمل قطعے کے لیے رجوع کیجیے.....مولانا حالی: کلیاتِ نظمِ حالی دوم، ۴۱۸-۴۱۹

۳۳ ایضاً، ص۴۳

۳۴ ایضاً، ص۴۳

۳۵ ڈاکٹر محمد الیاس: علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط، ص۴۴

۳۶ مولانا حالی بنام حامد حسن نعمانی، مرقومہ ۱۹۰۷ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط، ص۱۵۲-۱۵۳

۳۷ مولانا حالی بنام مینیجر الندوہ، مشمولہ مقالاتِ شبلیہشتم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبعِ جدید ۲۰۱۰ء، ص۱۹۲۔ رباعی کے لیے رجوع کیجیے.....مولانا حالی: کلیاتِ نظمِ حالی دوم، ص۳۷۷

۳۸ شبلی نعمانی: مقالاتِ شبلیہشتم، ص۱۹۲

۳۹ شبلی نعمانی بنام زہرا فیضی، مرقومہ ۲ر مئی ۱۹۰۸ء، مشمولہ خطوطِ شبلی، بھوپال: ظل السلطان بک ایجنسی، ص۹۴

۴۰ مولانا حالی بنام شبلی نعمانی، مرقومہ ۱۹۰۸ء، مشمولہ علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط، ص۴۶

۴۱ ایضاً، ۴۶-۴۷

۴۲ شبلی نعمانی بنام ابوالکلام آزاد، مرقومہ ۱۵ر جون ۱۹۰۹ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلی اوّل، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، طبعِ جدید ۲۰۱۰ء، ص۲۵۱

۴۳ شبلی نعمانی بنام مہدی حسن افادی، مرقومہ ۸ر مئی ۱۹۰۹ء، مشمولہ مکاتیبِ شبلیدوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۱۷ء، ص۲۵۲

۴۴ سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، ص۸۰۷-۸۰۸

۴۵ آلِ احمد سرور: مقدمہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص۶

حالی کی ملّی شاعری میں نعتیہ عناصر

محمد طاہر قریشی ☆

Abstract

Haali ki milli shairi main naatiya anasir

The concept of one Muslim nationhood (*Millat*) is given by Prophet Hazrat Muhammad (SAW).Since the poetry of *Millat* is a sum of Islamic *Millat* and its affairs.The axis on which this poetry revolves is logically the axalted being the Prophet Muhammad (SAW). It means that the Naat elements are the basic elements of *Milli* poetry.

This article aims to outline the traces of *Naat* elements in the *Milli* poetry of Maulana Altaf Hussain Haali. Haali was not only the prominent *Milli* poet but the very important poet of *Naat* also.

Key words: *Altaf Hussain Haali ,Milli Poetry ,Naat*

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) سے قومی اور ملّی شاعری کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کھونے کے بعد مسلمان بحیثیت قوم سخت احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے۔ انگریزوں کے انتقامی رویّے اور ہندوؤں کی تنہا پرواز کی

☆ ڈاکٹر محمد طاہر قریشی، استاد اردو، ڈی۔جے۔سندھ گورنمنٹ سائنس کالج، کراچی۔

خواہش نے بھی مسلمانوں کو الگ تھلگ کر دیا تھا۔ اردو ہندی تنازع اس کی ایک روشن مثال ہے جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں کو دُلھن کی دو حسین آنکھوں[۱] سے تشبیہہ دینے والا سرسیّد بھی اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا[۲] اور اس کی باقی ماندہ زندگی صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے مسائل کے حل کے لیے وقف ہو گئی۔ سرسیّد کی اصلاحی تحریک ہمہ جہت تحریک تھی اور اس کا دائرہ کار محض تعلیم کے شعبے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی پر محیط تھا۔ وہ شعر و سخن میں بھی اصلاح احوال کے خواہاں تھے اور شعر کو انفرادی ہی نہیں اجتماعی احساسات کی ترجمانی کا فریضہ بھی سونپنا چاہتے تھے۔ خوش قسمتی سے انھیں حالی جیسا مخلص ساتھی مل گیا۔ جنھوں نے اپنی زوردار شاعری کے ذریعے اصلاحی تحریک کو تقویت بخشی اور اردو شاعری کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔

الطاف حسین حالی بھی اقبال کی طرح وطنیت سے ملّت کی طرف آئے۔ تاہم ملّت کے علم بردار ہونے کے باوجود وہ حبّ وطن سے بے بہرہ نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے حبّ وطن کو حبّ ملّت پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ دراصل مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا انھیں جتنا رنج تھا شاید ہی کسی اور چیز کا ہو[۳]۔ اسی باعث ان کی شاعری کا رخ امّت مسلمہ کی جانب مڑ گیا یا زیادہ صحیح معنوں میں برّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے معاملات ان کی توجہ کے مرکز بن گئے اسی لیے حالی کے ملّی تصورات میں ماضی اور حال کے تاریخی رشتے کے باوصف وہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں ہے جو اقبال کے ہاں ہے[۴]۔ لیکن اس کی بھی ایک وجہ ہے حالی جس بحرانی دور سے تعلق رکھتے تھے اس کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے ذہن و فکر کے دائرے کو ہندی مسلمانوں کے مسائل تک محدود رکھتے۔ گویا محدود قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں کی تنظیم، تحریکِ احیائے ملّت کے آغاز کے لیے اوّلین شرط تھی[۵]۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ حالی کے خیالات میں تبدیلی سرسیّد سے ملاقات کے بعد ہوئی۔ یہ مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ حالی ایک دردمند دل رکھنے والے شریف النفس انسان تھے۔ مذہب سے انھیں گہرا شغف تھا[۶]۔ مسلمانوں کی کس مپرسی اور پستی کا احساس انھیں مضطرب کیے رکھتا تھا۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ''حالی کا ادبی احساس پستی، سرسیّد کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ از خود انفرادی طور پر پیدا ہوا اور اس احساس نے عبرت اور غیرت دلا کے سرسیّد کا ہمنوا بنا دیا''[۷]۔

گویا سرسیّد نے مہمیز کا کام دیا یعنی قومی درد کا جذبۂ مشترک دونوں کو قریب لایا اور حالی اسی جذبۂ مشترک کے باعث سرسیّد کے گرویدہ تھے[۸]۔ حالی کی قومی شاعری کی بنیاد ان کی نظم ''مبارک باد'' سے پڑی جو ۱۸۷۵ء میں جب، ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کا دن تھا اور علی گڑھ مدرسے کی رسم افتتاح عمل میں آئی تھی، لکھی گئی[۹]۔ تاہم ان کی ملّی شاعری کا صحیح معنوں میں بھرپور طریقے سے آغاز و اظہار ان کی لازوال نظم ''مدّ و جزر اسلام'' سے ہوا جو مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی تھی اسی لیے ''مسدس مدّ و جزر اسلام'' یا پھر ''مسدس حالی'' کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں شاید ہی کوئی نظم اس سے زیادہ شائع ہوئی ہو۔ ۱۸۷۹ء میں شائع شدہ یہ نظم ''ایک بڑے کینوس پر قومی بدبختی کی طویل داستان ہے''[۱۰]۔ حالی کے نزدیک یہ نظم خواہ ''اُبالی کھچڑی'' اور ''بے مرچ سالن'' ہی کیوں نہ ہو حقیقت تو یہ ہے کہ ''انیسویں صدی میں مشرق میں اس پائے کی کوئی نظم نہیں لکھی گئی''[۱۱]۔ اگرچہ اس میں شاعرانہ خوبیاں یا فنّی کمالات کا مظاہرہ نہیں ہے۔ لیکن یہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی ایسی داستان ہے جو ایک دردمند دل سے نکلی ہے اسی لیے دلوں پر اثر کرتی ہے[۱۲]۔

ادب میں حالی کے دو کارنامے ہیں۔ ایک مقدمہ شعر و شاعری اور دوسرے مسدس ۱۳۔ مسدس حالی کو اس لحاظ سے ایک عہد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کے خوابیدہ احساس کو بیدار کر کے ان کے تنِ خفتہ میں زندگی کی نئی روح پھونکی ۱۴۔ آل احمد سرور نے صحیح کہا ہے کہ ''مسدس نے صرف حالی کی شاعری کے ذریعے سے ہی حال کی پستی کا احساس پیدا نہیں کیا اس نے پوری اردو شاعری کو ماضی کے خوابوں سے چونکا کر حال کی تلخیوں کا احساس دلایا'' ۱۵۔

چونکہ ملّت کا تصوّر صاحب ملّت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی دین ہے اس لیے ملّی شاعری خواہ کسی پیرائے میں کی جائے محورِ ملّت، ختمی مرتبت ﷺ کے تذکرۂ مبارک کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ''مسدس مدوجزر اسلام'' جیسی طویل نظم میں بھی پچیس تیس بند ایسے ہیں جو مکمل طور پر نعتیہ پہلو کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی مسدس میں جگہ جگہ ایسے اشعار موجود ہیں جن میں نعتیہ عناصر نظر آتے ہیں۔ چند منتخب بند اور اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہؐ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے در گزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا ۱۶

ممتاز حسن کے خیال میں ''اردو میں کوئی نعت حالی کے مسدس کے ان دو بندوں کے برابر موجود نہیں ہے'' ۱۷۔ صالحہ عابد حسین کا بھی یہی کہنا ہے کہ ''مسدس حالی کے چند نعتیہ بند اردو شاعری کے سارے نعتیہ کلام پر بھاری کہے جا سکتے ہیں'' ۱۸۔ حالی نے سرکار ﷺ کی ذات بابرکات کے فیوض عرب کے جاہل معاشرے پر اس طرح بیان کیے ہیں:

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اِک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے جگا دی — اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے ۱۹

آنحضرت ﷺ کی تبلیغی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں:

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا — حقیقت کا گر ان کو ایک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا — بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا
کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اٹھا کر ۲۰

اسوۂ حسنہ کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے:

سکھائی انھیں نوع انساں پہ شفقت — کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسایہ سے رکھتے ہیں وہ محبت — شب و روز پہنچاتے ہیں اس کو راحت
وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر — نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر — پڑے غم کا سایہ نہ اس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر ۲۱

اسی طرح مسلسل کئی بند ہیں جن میں تعلیماتِ نبوی ﷺ بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً:

ڈرایا تعصّب سے ان کو یہ کہہ کر — کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر — وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اس کے یاور
نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرا
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

بچایا برائی سے ان کو یہ کہہ کر — کہ طاعت سے ترکِ معاصی ہے بہتر
تورّع کا ہے ذات میں جن کی جوہر — نہ ہوں گے کبھی عابد ان کے برابر
کرو ذکر اہلِ ورع کا جہاں تم
نہ لو عابدوں کا کبھی نام واں تم ۲۲

اسی قبیل کے بند اور بھی ہیں۔ نیز مسدس میں جستہ جستہ بھی ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو واضح طور پر نعت کا پہلو رکھتے ہیں:

ہوئی پہلوے آمنہ سے ہویدا دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ
یہ سنتے ہی تھرّا گیا گلّہ سارا یہ راعیؐ نے للکار کر جب پکارا
ہوئی مقتضی جب کہ حکمت خدا کی کہ تعلیم جاری ہو خیرالوریٰؐ کی
مگر حیف اے فخر آدمؑ کی امّت ہوئی آدمیت بھی ساتھ اس کے رخصت
وہ ارکان شرعِ متیں کے کہاں ہیں وہ وارث رسول امیںؐ کے کہاں ہیں
ستوں، چشمِ بد دور، ہیں آپ دیں کے نمونہ ہیں خلقِ رسولِ امیںؐ کے
اگر بھولتے ہم نہ قولِ پیمبرؐ کہ ''سب ہیں مسلمان باہم برابر''
عدالت کے زیور سے تھے سب مزیّن پھلا اور پھولا تھا احمدؐ کا گلشن[۲۳]

مسدس کے اختتامی بندوں میں بھی بارگاہِ رب العزّت میں سرورِ کونین ﷺ کا واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں:

الٰہی بحقِ رسولِ تہامیؐ ہر اک فردِ انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی برابر تھے مکّی و زنگی و شامی
شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نباہا
بُروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا[۲۴]

بے شک مسدّس سرسیّد کی فرمائش پر لکھا گیا لیکن اس نظم میں ''شاعر کے احساسات اتنی بلند سطح پر اور تخلیقی لگن اتنی کامل ہے کہ فرمائش ایک تخلیقی تجربہ بن گئی ہے''[۲۵]۔ مسدّس میں جو اثر و تاثیر ہے اس میں شاعر کا سوزِ دروں شامل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالی اس مسدس کے سوا کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اردو شاعری میں ان کا نام زندہ رہتا۔ سرسیّد نے اس مسدس کو فن شاعری کی تاریخ جدید بے سبب نہیں کہا ہے اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''اردو کی رہتی دنیا تک اس کے متعلق ہمیشہ لکھا جائے گا''[۲۶] اور اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسدس کے زیادہ زوردار اور پُر تاثیر بند وہ ہیں جو یا تو مکمل طور پر نعتیہ ہیں یا جزوی طور پر نعتیہ عناصر کے حامل ہیں۔

حالی کی کلیات میں مسدس کے بعد ہی ان کی نظم ''عرض حال بجانبِ سرورِ کائنات افضل علیہ الصلوات واکمل التحیات'' کے عنوان سے موجود ہے جو ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی۔ ''یہ نظم بھی قوی درد سے مملو ہے''[۲۷]۔ عنوان سے یہ بظاہر نعتیہ نظم دکھائی دیتی ہے لیکن یہ ایک ایسی ملّی نظم ہے جس کا عنوان، آغاز، درمیان اور اختتام سب نعتیہ عناصر کے حامل ہیں۔ حالی دربارِ رسالت ﷺ میں امّت کی فریاد لے کر پہنچے ہیں اور التجا کرتے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے امّت پہ تریؐ آ کے عجب وقت پڑا ہے

آگے چل کر وہ تفصیل سے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بیان کرتے ہیں اور مسلمانوں نے اپنے دین کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا احوال بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی — دیں داروں میں پر آب ہے باقی، نہ صفا ہے

قوم کی حالت زار کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی — پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

کبھی گھبرا کر فریاد کرتے ہیں:

فریاد ہے اے کشتیٔ امت کے نگہباں — بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی — دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

حالی کبھی حضور اکرم ﷺ کا عفو و درگزر یاد کرتے ہیں:

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا — جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے
صدمہ دُرِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہنچا — کی ان کے لیے تو نے بھلائی کی دعا ہے
کی تو نے خطا عفو ہے ان کینہ کشوں کی — کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے
سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحم — ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے

تو کبھی یوں درخواست گزار ہوتے ہیں:

کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں — خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

امتیوں کی اپنے نبیؐ سے وابستگی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن — دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے
ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے — وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے
جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اُڑتی — وہ خاک ہمارے لیے داروئے شفا ہے
جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف — اب تک وہی قبلہ تری امت کا رہا ہے
جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت — کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے
کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا — اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے — نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

پھر کچھ شکایت، کچھ ناز کے انداز میں کہتے ہیں:

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ اور زیادہ — اخبار میں الطالح لی ہم نے سنا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی — ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

کبھی شکوے کے لیے تیز ہو جاتی ہے:

عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں — اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

لیکن یہاں پہنچ کر حالی ٹھٹھک جاتے ہیں ان کی دینی تربیت اور ادب کا جذبہ آڑے آتا ہے اور وہ ندامت کا اظہار کر کے نظم کا خاتمہ کر دیتے ہیں:

ہاں حالیؔ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے — باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کونؐ مخاطب — یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ، خطا ہے ۲۸

حالی کی ایک اہم نظم ''شکوۂ ہند'' بھی اسی سال یعنی ۱۸۸۸ء میں لکھی گئی۔ مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کا حالی کو جو رنج ہے وہ اس نظم میں کافی نمایاں ہے ۲۹۔ یہ نظم ''ایک تہذیبی واسوخت ہے'' ۳۰۔ برعظیم کے مسلمانوں کے ساتھ اس دور میں جس قسم کا جانب دارانہ سلوک کیا گیا ''شکوۂ ہند'' اس کا ''ردِ عمل ہے'' ۳۱۔ مسلمانوں کے علیحدہ ملی تشخص کا اس نظم میں بھرپور طریقے سے اظہار ہوا ہے۔ یہاں آ کر شاعر نے ہندو اور مسلمان کی واضح تقسیم کر دی ہے گویا جداگانہ قومیت کے نظریے کو ایک نئی توانائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظم کے آغاز میں ہی شاعر نے اپنے ارادوں کا اظہار کر دیا ہے:

رخصت اے ہندوستاں! اے بوستانِ بے خزاں — رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

مسلمانوں کو بدیسی مہمان قرار دے کر شاعر نے ''دیسی میزبان'' سے اپنی راہیں الگ کر لی ہیں اور اس بات کا ادّعا کیا ہے کہ:

تھی ہماری قوم و ملت، رسم و عادت سب جدا — رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

اپنی منفرد ملی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ملّت بیضا نے قوموں کی مٹا دی تھی تمیز — تھے بلالؓ و جعفرؓ و سلماںؓ برابر محترم

اس نظم میں بھی ایک مقام پر نعتیہ عنصر نظر آتا ہے۔ شاعر سرزمینِ ہندوستان سے شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

پھوٹ سے واقف نہ تھے ہم تیری اے ہندوستاں — احمدیؐ اخلاق و اسلامی اخوت ہم میں تھی ۳۲

''فلسفۂ ترقی'' کے عنوان سے ایک نظم مولانا حالی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سترھویں اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۰۳ء میں پڑھی تھی ۳۳۔ پند و نصائح سے بھرپور اس نظم میں جا بجا نعتیہ عناصر موجود ہیں۔ شاعر نے سرورِ دو عالم ﷺ کے مبارک حوالے سے مسلمانوں کو جوش دلانے کی کوشش کی ہے تا کہ قوم جدوجہد سے منہ نہ موڑے اور ترقی کے لیے اپنی ساری قوتیں بروئے کار لائے:

دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام — ہے مسلمانو! یہ ارشاد رسولِ انس و جانؐ
جس کا تم بھرتے ہو کلمہ جسؐ پہ پڑھتے ہو درود — نام پر جسؐ کے عزیزو! تم فدا کرتے ہو جاں
جیتے جی امّت کی لو دل کو رہی اسؐ کے لگی — وقتِ آخر امّت اُسؐ کے تھا ورد زباں
وہ رسولِ ہاشمیؐ وہ رحمت للعالمیںؐ — پیروی کا جس کی دم بھرتے ہو تم صبح و مسا
جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اس کا سلوک — اُس طرف سے تھی جفا اور اس طرف سے تھی دعا ۳۴

''انجمن حمایت اسلام اور اس کے کام'' کے نام سے یہ نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے ۱۹۰۴ء میں پڑھی گئی تھی۔ اس جلسے میں اقبال بھی شریک تھے ۳۵۔ انجمن کی مساعیٔ جمیلہ کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے حالی نصیحت کرتے ہیں:

ناداں ہاتھوں سے اُس امت کی کھینی ہے تمھیں تھا کھویا جس کے بیڑے کا رسول انس و جاںؐ ۳۶

۱۹۰۵ء میں ''ترغیبِ امدادِ یتیماں'' حالی نے انجمن مویدِ اسلام دہلی کے جلسے میں پڑھی ۳۷۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے حالی نے اس نظم میں یتیموں کی امداد کی ترغیب و تلقین پر اپنا پورا شاعرانہ زورِ صرف کیا ہے اور بار بار خلقِ محمدی ﷺ کی جھلک دکھلا کر امداد کی رغبت دلائی ہے:

امّت میں ہو تم اُسؐ کی جو امّت پہ فدا تھا لو تم بھی عزیزو اسی امّت سے لگاؤ
وہؐ جیسا غریبوں کا، یتیموں کا تھا عاشق تم بھی انھیں آنکھوں پہ اسی طرح بٹھاؤ
جو خلق تھا ہر بے کس و ناچار سے اُسؐ کا اخلاق میں کچھ اس کی جھلک تم بھی دکھاؤ
کڑھتا تھا وہؐ جس طرح مصیبت پہ ہر اک کی جی تم بھی مصیبت پہ یونہی سب کی کڑھاؤ ۳۸

الطاف حسین حالی کی شاعری سے ان چند مثالوں کا انتخاب یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قومی و ملّی شاعری کو وقار، حالی کی دین ہے۔ ان کی ملّی شاعری میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت پر بہت نمایاں اور واشگاف الفاظ میں زور دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حالی نے بھرپور طریقے سے دوقومی نظریے کا پرچار، اعلیٰ درجے کی شاعری میں کیا ہے اور اس کام کے لیے انھوں نے دوقومی نظریے کے بانی رحمت عالم ﷺ کے ذکر مبارک کا جابجا سہارا لیا ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے حالی کی مسدس کو اردو میں قومی شاعری کی پہلی بلند آواز کہا ہے ۳۹۔

حالی کا شمار نعت کے بھی اہم ترین شعراء میں کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی محبت اور ان کا ادب حالی کے مزاج میں جس طرح رچا بسا تھا اس کا اظہار ان کی نعتیہ شاعری میں تو بخوبی ہوا ہی ہے ملّی شاعری میں بھی اس کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی امّت مسلمہ کو یک جہتی اور اتحاد کا سبق سرورِ کائنات ﷺ ہی کے نام نامی کے ذریعے دیا ہے۔ اور اسی لیے انھوں نے نبیؐ کریم ﷺ کے شمائل اور فضائل سے زیادہ خصائل پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ دنیا میں کہیں بھی اگر مسلمانوں کو دوسری قوموں میں سربلند ہونا ہے تو اس کے لیے اسوۂ رسول ﷺ کو اپنانا پڑے گا ورنہ ذلّت و خواری ہر جگہ مسلمانوں کا مقدر بنی رہے گی۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، ص ۳۲۷

۲۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۳۔ جذبی، معین احسن، حالی کا سیاسی شعور، ص ۱۲۱

۴۔ صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، دیباچہ کلیات نظم حالی (جلد اوّل)، ص ۶۰

۵۔ ایضاً، ص ۶۱

۶۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، تنقیدی نقوش، ص ۱۷۴

۷۔ حالی کا ذہنی ارتقا، ص ۲۵

۸۔ ہاشمی، نورالحسن، ڈاکٹر، مقام حالی، مشمولہ: نقش حالی (حصہ دوم)، ص ۲۳۷

۹۔ خان، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، حالی کا ذہنی ارتقا، ص ۴۶

۱۰۔ قریشی، وحید، ڈاکٹر، مطالعۂ حالی، ص ۷۰

۱۱۔ خان، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۷۰

۱۲۔ ہاشمی، نورالحسن، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۲۳۷

۱۳۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، تجربے اور روایت، ص ۱۵۰

۱۴۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ہلی نشاۃ الثانیہ کا نقیب، حالی، مشمولہ: صحیفہ (حالی نمبر)، ص ۶۳

۱۵۔ نئے اور پرانے چراغ، ص ۱۹

۱۶۔ کلیات نظم حالی (جلد دوم)، ص ۶۴

۱۷۔ مقالاتِ ممتاز، ص ۹۴

۱۸۔ یادگارِ حالی، ص ۱۲۵

۱۹۔ کلیات نظم حالی (جلد دوم)، ص ۶۴۔۶۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۹۔۷۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۰۔۷۱

۲۳۔ ایضاً، ص ۶۳۔۱۱۸

۲۴۔ کلیات نظم حالی (جلد دوم)، ص ۱۷۵

۲۵۔ قریشی، وحید، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۳۸

۲۶۔ حالی کا ذہنی ارتقا، ص ۶۷

۲۷۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، مسدس حالی، عوامل، مقاصد، نتائج، مشمولہ: صحیفہ (حالی نمبر)، ص ۵۴

۲۸۔ جذبی، معین احسن، محولہ بالا، ص ۱۲۱

۲۹۔ کلیات نظم حالی (جلد دوم)، ص ۱۷۷۔۱۸۲

۳۰۔ خان، سہیل احمد، قومی وملّی شاعری، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند (جلد نہم)، ص ۳۰۰

۳۱۔ خان، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۲۴۸

۳۲۔ کلیات نظم حالی (جلد دوم)، ص ۱۸۲۔۱۹۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۷۴۔۲۷۵

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۷۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۸۷

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۸۹

۳۹۔ تجربے اور روایت، ص ۱۵۲

فہرست اسناد محولہ:

اختر، سلیم، ڈاکٹر، ۱۹۷۲ء، مسدس حالی، عوامل، مقاصد، نتائج، مشمولہ: صحیفہ (حالی نمبر)، مجلس ترقی ادب، اشاعت جنوری، شمارہ ۵۸

جذبی، معین احسن، ۱۹۶۳ء، حالی کا سیاسی شعور، آئینہ ادب، لاہور

حالی، الطاف حسین، ۱۹۶۸ء، کلیات نظم حالی (جلد اول)، مرتب، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، بار اول

_____، ۱۹۷۰ء، کلیات نظم حالی (جلد دوم)، مرتب، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، بار اوّل

_____، ۱۹۷۱ء، حیاتِ جاوید، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، بار دوم

حسن، ممتاز، ۱۹۹۵ء، مقالات ممتاز، مرتب شان الحق حقی، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، بار اول

خان، سہیل احمد، ۱۹۷۲ء، قومی وملّی شاعری، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند (جلد نہم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

خان، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، ۱۹۶۶ء، حالی کا ذہنی ارتقا، مکتبہ کارواں، لاہور، بار دوم

ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۹۷۲ء، ملّی نشاۃ الثانیہ کا نقیب، حالی، مشمولہ: صحیفہ (لاہور)، حالی نمبر، مجلس ترقی ادب، جنوری، شمارہ ۵۷

سرور، آل احمد، پروفیسر، ۱۹۵۱ء، نئے اور پرانے چراغ، اردو مرکز، لاہور، بار دوم
صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، ۱۹۵۹ء، تجربے اور روایت، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، بار اول
صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، ۱۹۶۸ء، دیباچہ، کلیات نظم حالی (جلد اول)، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول
قریشی، وحید، ڈاکٹر، ۱۹۶۶ء، مطالعۂ حالی، نقوش پریس، لاہور، بار دوم
عابد حسین، صالحہ، ۱۹۷۵ء، یادگارِ حالی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، بار چہارم
عبدالقیوم، ڈاکٹر، ۱۹۶۳ء، تنقیدی نقوش، مشتاق بک ڈپو، کراچی، بار اول
ہاشمی، نورالحسن، ڈاکٹر، س ن، مقام حالی، مشمولہ: نقش حالی (حصہ دوم)، مرتبین، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی و سید احتشام حسین رضوی و شجاعت علی سندیلوی، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ

وفیات معارف شائع ہوگئی ہے

وفیات نویسی کے حوالے سے اہم کتاب وفیات معارف ادارۂ قرطاس کی جانب سے شائع ہوگئی ہے جو بیسویں صدی کی سات سو سے زائد علمی، ادبی، دینی اور سیاسی شخصیات کے تذکرے پر مبنی ہے۔ یہ تذکرے معارف، اعظم گڑھ میں شائع ہوئے ہیں۔

مرتبہ:

حافظ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

صفحات: ۸۵۰ (بڑا سائز) قیمت: ۱۵۰۰/- روپے طبع اوّل ۲۰۱۳ء

ISBN: 978-969-9640-02-5